ہے.. عشق کی پینگ کے ہلارے سے نجات حاصل کر لی ہے اور وہ اب صرف غم حسین میں روتی ہے..

یا پھر یہ خط اُن زمانوں سے پچیس برس بعد اِن زمانوں میں وہ جہاں کہیں بھی ہے.. اگر ہے تو.. لکھا گیا ہے اور اس میں صرف ایک سطر ہے..

''رودین میں لوٹ آئی ہوں.. تمہاری نتالیہ..''

جولاہے کی داڑھی کھڈی کے تانے پیٹے کے دھاگوں کو چھونے لگی تھی کیونکہ اسے سُوت کی وہ گانٹھ سلجھاتے جو ایک ہموار اور پھولدار کھیس بننے کی راہ میں رکاوٹ ہوگئی تھی پچیس برس ہو گئے تھے..

اگر وہ احتیاط نہ برتے تو داڑھی کے سفید بال تانے پیٹے کے دھاگوں میں الجھ کر کھیس میں بُنے جا سکتے ہیں..اس لیے وہ اپنی گردن سیدھی رکھے کھڈی چلاتا تھا تاکہ اس کے سفید بال تانے پیٹے کا حصہ نہ بن جائیں..

اب جا کر پچیس برس بعد کھیس کی سطح ہموار ہو رہی تھی..اس میں کوئی اٹک ایسی نہ رہی تھی جو اس کی بناوٹ میں رکاوٹ ہو..

وہ تو نہ آئی جو گم ہو چکی تھی..

البتہ یہ ہے کہ وہ خط جو ایک نتالیہ نے ایک اَن دیکھے رودین کی چاہت کے ہاتھی تلے روندے جانے کے دوران لکھے تھے..خستہ اور بھربھرے ہو رہے تھے'ان کی رنگت خزاں میں جا چکی تھی کہ حساب کتاب کے رجسٹر سے پھاڑے جانے والے فل سکیپ اوراق کا کاغذ بہت معمولی اور درمیانے درجے کا ہوتا ہے..وہ خط آ گئے!

ایک نادیدہ' غیر قدرتی اور نہ سمجھ میں آنے والے عشق میں بندھی نتالیہ کی گانٹھ کھولنے میں پچیس برس صرف ہو گئے تھے اور تب کہیں جا کر..جب جولاہے کی داڑھی کے سفید ریشمی بال تانے پیٹے کو چھونے لگے تھے..کھیس کی بُنت میں روانی نے جنم لیا تھا..

یہ نہیں کہ صرف جولاہے پر..بلکہ رودین اور نتالیہ پر بھی وہ پچیس برس گزر چکے تھے..

برس ہا برس بعد جب وہ دونوں اپنے چہرے پر بُنی جھریوں پر یقین نہ رکھتے تھے اور

بالوں کو انتہائی احتیاط سے ایک ایک بال الگ کر کے رنگتے تھے اور ایک دوسرے کے وجود اور مقام سے آگاہ تک نہیں تھے کہ کون کہاں ہے تب ایک نتالیہ اپنے رودین کو ایک اور خط.. برس ہا برس کے تعطل کے بعد.. پھر سے لکھ سکتی تھی.. صرف ایک سطر میں ''رودین میں لوٹ آئی ہوں.. تمہاری نتالیہ..''

لیکن ایسا نہیں ہوا تھا..

جولاہی اتنے برسوں میں برنے کی پینگ سے اتر آئی ہوگی.. ہاتھی عشق کے تلے روندے جانے کے بعد اپنے زخم سہلاتی پھر سے بھلی چنگی ہوگئی ہوگی.. خاوند اور اولاد کے دھاگوں میں بندھ کر کسی روایتی کھیس میں بُنی گئی ہوگی..

لیکن ایسا بھی نہیں ہوا تھا..

ایسا ہونا چاہیے تھا، کیوں نہ ہوا..
وہ دراصل کینسر وارڈ میں نہیں تھی..

نتالیہ!

پچیس برس بعد آستانۂ رومی کی نتالیہ کینسر وارڈ میں نہیں تھی.. کسی بھی ہسپتال کے کسی عام سے وارڈ میں تھی جہاں درجنوں عورتیں نہایت معمولی عوارض میں مبتلا یا مکمل صحت مند حالت میں صرف اس لیے استراحت فرماتی تھیں کہ وہ فُلی انشورڈ تھیں۔ انہوں نے پچھلے کئی برس سے کئی ہزار ڈالر اپنی کئی جائز ضرورتیں پس پشت ڈال کر ہیلتھ انشورنس کے تسلسل کے لیے خرچ کیے تھے اور جب انہیں کوئی بھی عارضہ لاحق نہ ہوا.. کسی جان لیوا مرض نے آ نہ لیا تو کسی حد تک مایوس ہوئیں اور اب یونہی سینے میں معمولی درد.. گھٹنوں کے گاؤٹ یا سر چکرانے جیسے عوارض بیان کر کے یہاں اپنی انشورنس کے پیسے پورے کرنے کی خاطر استراحت فرماتی تھیں..

ان میں زیادہ تر سنگل ورکنگ وومن تھیں جو اکثر سرِشام غائب ہو جاتیں اور صبح سویرے ہنستی کھلکھلاتی.. اوہ وہاٹ اے نائٹ.. کی اطلاع فراہم کرتیں اپنے اپنے بستروں پر لیٹ جاتیں..

صرف نتالیہ تھی جس نے اس عام سے وارڈ کو کینسر وارڈ بنا دیا تھا..

امریکہ میں صحت اور تندرستی کا ایک ایسا پاگل پن ہے جس میں کسی بھی صحت مند اور تندرست شخص کو شک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور اسے کتابوں، میڈیا اور حکومت کی جانب سے یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ اگر اسے کوئی بھی بیماری نہیں تو وہ یقیناً ایک صحت مند امریکی نہیں ہے۔ اس لیے باقاعدہ چیک اپس ایک روٹین ہیں..

کسی شخص کے چہرے پر اگر ایک پھنسی بھی نکل آئے تو خطرے کے الارم بجنے لگتے ہیں..

ایک ایسے ہی چیک اپ کے دوران نتالیہ کے رحم میں ایک نہایت معمولی بالیدگی..ایک پوتھی کے اوراق میں پوشیدہ سونے کے کسی مہین ذرّے سے بھی زیادہ مہین ایک نشوونما کا شائبہ ہوا جو کینسر بھی ہو سکتی تھی اور اسے فوری طور پر الگ کرنے کے لیے کسی بڑے آپریشن کی ضرورت نہ تھی صرف اس کی ناف میں ایک نہایت حساس آلہ داخل کر کے اسے کاٹ دیا جانا تھا۔

نتالیہ نے اپنے ہم وطن ڈاکٹر کی یہ تشخیص سنی تو اسے اور کچھ سنائی نہ دیا کہ یہ ایک نہایت معمولی گروتھ ہے..اور اس کے لیے کسی بڑے آپریشن کی ضرورت نہیں ہے..اس نے اس ساری تشخیص میں سے صرف کینسر کا لفظ سنا اور ہراساں ہوگئی..

آستانۂ رومی کے اردگرد جتنے بھی وہم اور خوف تھے..جنہیں وہ پیچھے چھوڑ آئی تھی' وہ سب کے سب اتنے برسوں بعد بہترین مواقع کی حامل سرزمین یعنی امریکہ میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے پہنچ گئے کہ ان کی زبان میں کینسر کا ترجمہ صرف موت تھا..

اور وہ ہراساں ہوگئی..

اتنی زیادہ کہ اس ہفتے اپنے بال بھی نہ رنگ سکی اور ان کی سفید جڑیں نمایاں ہونے لگیں..

چنانچہ جہاں وہ تھی' وہ کینسر وارڈ نہ تھا صرف نتالیہ کی موجودگی نے اور اس کے ہراس نے اسے ایسا بنا دیا تھا..

وہ کسی سے کلام نہ کرتی تھی..

بولتی نہ تھی..

ڈاکٹر چیک اپ کے لیے آتے تو اس کی شیٹ کا معائنہ کرتے ہوئے جو کچھ بھی پوچھتے وہ اس کے جواب میں ہاں یا نہ کے علاوہ کچھ نہ کہتی کہ وہ اتنی ڈر گئی تھی..

بستر کے سامنے کھڑکی کے آگے تنے باہر کے منظر کو روپوش کرتے جو پھولدار پردے تھے' وہ ان پر نظریں جمائے مسلسل ایک سحر زدہ شخص کی طرح انہیں تکتی رہتی..

ان پردوں میں خفیف سی حرکت ہوتی' وہ بے شک وارڈ کا دروازہ بند ہونے کے دباؤ سے ذرا سرسراتے تو وہ ان علامتوں میں سے اپنی حیات کی فال نکالنے لگتی..

میں زندہ رہوں گی.. یا نہیں؟

مجھے آپریشن تھیٹر میں لے جایا جائے گا تو کیا میں اسی بستر پر اسی پھولدار پردے کے سامنے واپس آؤں گی یا کہیں دفن کر دی جاؤں گی جہاں میرا خاوند یا بچے آئیں گے یا نہیں؟

اس کا انحصار صرف میرے سامنے کھڑکی کے آگے تنے پھولدار پردے پر ہے۔

اگر اس پر جو ایک شوخ رنگ گُلِ لالہ ہے وہ خفیف سی حرکت کرے گا تو میں واپس آ جاؤں گی..نہیں کرے گا' ساکت رہے گا تو دفن ہو جاؤں گی..

مر جاؤں گی..

وہ کچھ زیادہ ہی ڈر گئی تھی..

پردیس میں انسان ہمیشہ کچھ زیادہ ہی ڈرتا ہے..اسے اپنے وطن سے بچھڑے ہوئے مدتیں گزر چکی تھیں..وہ صدیوں سے اس دیس میں تھی اور اس کے باوجود کہ اس نے اپنے سارے بچے یہاں جنے تھے' یہ پردیس تھا..شاید پہلی بار اسے آبائی وطن کی صفت سے آگاہی ہوئی..اُس وطن میں ڈر کم ہوتا ہے..اگر وہ اِس لمحے آستانۂ رومی کی کسی کچی کوٹھڑی میں بے یار و مددگار بھی پڑی ہوتی تو اس میں ڈر نہ ہوتا..یہ صفت تھی وطن کی..اور یہاں..جہاں دنیا کی بہترین طبی سہولتیں تھیں..مرے بندے کو بھی بجلی کے دھچکے دے کر واپس لے آتے تھے..یہاں ڈر تھا..یہ صفت ہوتی ہے پردیس کی کہ اس میں ڈر بہت ہوتا ہے..

گُلِ لالہ سے مزین کھڑکی کے آگے تنا وہ پردہ اس کی آنکھوں کے لیے ایک ایسا ٹھہراؤ تھا جہاں وہ منجمد ہو گئی تھی..وہ ٹکٹکی باندھ کر اس کے پھولوں کو تکتی رہتی..کبھی پھولوں کی پتیاں حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوتیں صرف اس لیے کہ کوئی نرس اس کے قریب سے گزر گئی تھی..نتالیہ کی آنکھیں گویا اس میں نصب ہو گئی تھیں اور وہ اس کی خفیف سی حرکت سے اندازے لگاتی رہتی تھی..فال نکالتی رہتی تھی..

اسے ذاتی طور پر احساس نہ ہوتا کہ وہ گُلِ لالہ کے کسی ایک پھول پر پہروں سے نظریں جمائے ہوئے ہے..جب تک کہ ایک فربہ افرو امریکی نرس' جس کے کھلے منہ سے شراب کی بو ایسے برآمد ہوتی تھی جیسے سینٹ جارج کے ہاتھوں مارے جانے والے اژدھے کے منہ سے آگ نکلتی ہے..اس کے آگے کھانے کی سفید ٹرے کھسکا کر کہتا: ''بے بی..کم بیک ٹو دہیر یو بیلانگ..'' اور وہ چونک کر گُلِ لالہ سے واپس آ جاتی..''بے بی'' کا ساکت وجود زندہ ہو جاتا' پتھرائی ہوئی آنکھوں

میں جان آ جاتی..وہ اپنے سامنے رکھی سفید ٹرے میں قرینے سے سجی خوراک کو ایک نظر دیکھتی اور اسے ابکائی سی آ جاتی اور وہ بمشکل چند قتلے آلوؤں کے اور دودھ کا ایک گلاس حلق سے اتارتی..

اسے ابھی تک جب کہ وہ آستانۂ رومی میں بیتی ہوئی زندگی کے دنوں سے کہیں زیادہ دن زندگی کے اُردن اور امریکہ میں گزار چکی تھی..اس خوراک کی چاہت نہیں ہوتی تھی..اس کے نتھنے ابھی تک ہلدی اور ادرک کی بُو باس کے لیے پھڑکتے تھے..دیسی گھی کے تڑکے کو ترستے تھے..یہاں بھی' امریکہ میں' وہ ایک عرصہ اپنی خوراک کی بُو باس سے جُڑی رہی لیکن بچے ذرا بڑے ہوئے تو وہ اعتراض کرنے لگے کہ ممی ہمارے دوست ہمارے گھر آتے ہیں تو وہ بدبو کے باعث سانس نہیں لے سکتے..آپ کیوں اس قسم کے کھانے بناتی ہیں جو صرف آپ یا کبھی کبھار ڈیڈی کھا لیتے ہیں..کیا آپ دوسرے لوگوں کی مانند صاف ستھرے اور بدبو سے پاک کھانے نہیں بنا سکتیں؟

اس نے ہتھیار ڈال دیے لیکن کبھی کبھار صاف ستھرے کھانے حلق سے نگلتے نگلتے اس کی طبیعت ادبھ جاتی اور وہ چوری چھپے فرائنگ پین کو کھڑکی سے باہر نکال کر تڑکا لگا لیتی تا کہ گھر کے اندر اس کی مہک یا بچوں کی زبان میں اس کی بُو نہ پھیلے..پھر بھی اس کی چوری پکڑی جاتی اور بڑا بیٹا گھر میں داخل ہوتے ہی کہتا..''ممی! آپ کیوں باز نہیں آتیں..''اور وہ باز آ گئی..

ان دنوں جب وہ پلنگ پر ٹانگیں پسارے سردیوں کی دھند آلود دھوپ میں لیٹی رہتی تھی اور گاؤں کی عورتیں اس کی انگلیوں پر اپنے بوسے نچھاور کرتی تھیں اور وہ لہسن اور پیاز کی منتقل کردہ بُو سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اپنی انگلیاں بار بار دھوتی تھی' تب ایک مریدنی آشاں بی بی نام کی تھی جو سرسوں کے گندلوں کے ساگ کو اپنی ڈوری میں گھوٹ گھوٹ کر' اس میں جی بھر کر مرچیں' لہسن اور ادرک ڈال کر اسے ایک کچی ہانڈی میں کچے چولہے پر پکا کر..اور اس کے ذائقے میں آشاں بی بی کی وہ پھونکیں بھی شامل ہوتی تھیں جو اُپلوں کو سلگانے کی کوشش میں وہ پھونکتی تھی اور اپنی آنکھیں بیر بہوٹی کی مانند سرخ کر لیتی تھی اور پھر اس ساگ کی ہانڈی سیدزادی کے قدموں میں رکھ کر التجا کرتی تھی کہ..آلِ نبیؐ..اولادِ نبیؐ..اس ساگ کو ڈنگروں کے آگے ڈالنے سے پہلے صرف چکھ لو تو میری مراد پوری ہو جائے گی..

آشاں بی بی کے لیے وہ..سیدزادی ایک کرشن تھی اور جیسے کرشن کی ایک مریدنی نے ان کے چرنوں میں بیروں کی بھینٹ چڑھانے سے پیشتر ہر بیر کو چکھ لیا تھا کہ کہیں یہ کھٹا تو نہیں اور

کرشن کے کان بھرے گئے تھے کہ دیکھو بھینٹ کیا ہوا ہر بیر دانتوں سے کترا جا چکا ہے..لیکن وہ بدگمان نہ ہوئے کہ وہ جانتے تھے کہ مریدنی نے ایسا عقیدت اور محبت میں ڈوب کر کیا ہے تو ایسے ہی آشاں بی بی اس بھینٹ کیے جانے والے ساگ کو پہلے چکھتی تھی کہ کہیں اس میں کڑواہٹ تو نہیں..

اور آشاں بی بی کی جہالت اور عقیدت یہ کیسے جان سکتی تھی کہ جس کرشن کی وہ گوپی ہے..دراصل وہ ایک اور کرشن کی پجارن ہے..

اور آشاں بی بی یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ سیدزادی کا کرشن قدرے بے پرواتھا اور وہ اس کے غم میں جولاہی ہوگئی تھی..برنے کی سب سے اونچی شاخ کو اس کی ستواں سیدناک جا چھوتی تھی..ایک اندھیری کوٹھڑی میں ایک کھیس بنتے بنتے اسے مدتیں بیت چکی تھیں..اور یوں اس کے کولہے کی ہڈی پچیس برس تک ایک ہی مقام اور ایک ہی نشست پر بیٹھے بیٹھے پچک گئی تھی..چپٹی ہوگئی تھی..

لیکن اندھیاری کوٹھڑی کی کچی تنہائی میں مسلسل پچیس برس تک بیٹھا رہنے والا کھٹ کھٹ کھڈی چلانے والا تو ایک جولاہا تھا..

نہیں وہ جولاہی بھی تھی..

ان دونوں میں کچھ فرق نہ تھا..

وہ دونوں حق تھے..

یہ تو محض سراب ہیں کہ کھڈی پر کون بیٹھا ہے..اگر کھڈی کے تانے پیٹے کو ایک سفید ریش کے بال چھو رہے ہیں تو یہ محض سراب ہے...دکھاوا ہے...من تو شدم..تو من شدی...من دیگرم تُو دیگری....دونوں حق ہیں...

کولہے کی ہڈیاں مسلسل بیٹھے رہنے سے دونوں کی پچک چکی ہیں، چپٹی ہوگئی ہیں..

موت کے بعد ہڈیوں کی ساخت سے کھوج لگانے والے ماہر کسی بھی ڈھانچے کو پرکھتے ہوئے ان کی حیات کے بارے میں بہت کچھ جان جاتے ہیں..ریڑھ کی ہڈی کے جھکاؤ سے اندازہ لگا لیتے ہیں کہ کسی زمین دوز قبر میں سے برآمد ہونے والی یہ حنوط شدہ ممی دراصل فرعون کے دربار میں پیپرس کے ریشوں سے بنے ہوئے ایک کاغذ پر ہمہ وقت جھکے ہوئے ایک درباری منشی کی ہے..اور اگر اس ڈھانچے کے کولہے کی ہڈی چپٹی ہوتی تھی تو انہیں معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ شخص شاہی ملبوسات تیار کرنے والا ایک جولاہا تھا جو تمام عمر ایک ہی حالت میں بیٹھا ان کی

بُنت میں مصروف رہا..

ہزاروں برس بعد اس جولاہے یا جولاہی کا ڈھانچہ اگر کہیں سے برآمد ہوا تو وہ لوگ بھی جان جائیں گے..ان کی پچکی ہوئی کولہے کی ہڈیوں سے..کہ وہ ایک ہی مقام پر بیٹھے اپنے حیاتی کے' اپنے عشق کے کھیس بُنتے رہے تھے..

آشاں بی بی..کچے چولہے میں گیلے اپلوں میں پھونکیں مارنے والی..جب کہ وہ اپنے کرشن کے لیے ساگ کی سوغات پکاتی تھی یہ کیسے جان سکتی تھی کہ اس کے کرشن کے آگے اس کرشن کا بھی ایک اور کرشن ہے..!

یہ گمشدہ زمانوں کے قصے تھے..

لمحۂ موجود میں نہ کوئی کرشن تھا اور نہ کنہیا..

ایک وارڈ تھا جسے نتالیہ کی موجودگی نے کینسر وارڈ بنا دیا تھا..

صرف سرسوں کا آشاں بی بی کی پھونکوں کے ذائقے والا' سرسوں کا ساگ نہ تھا جو اس کے نتھنوں میں اداسی اور بے وطنی کے ذائقے بھرتا تھا....مکھڈی..میٹھا اور مٹی کی مہک سے ہمکتا حلوہ بھی تھا جو فتح جنگ سے آئی ہوئی ایک مریدنی اس کے چرنوں میں رکھتی تھی..

اس کے شکاری باپ کی ماری ہوئی..اگر وہ انہیں مارتا تھا تو..کچھ مرغابیاں..تیتر اور تلور بھی تھے..

اگرچہ مرغابیاں چار بھی ہوتیں تو ان کا خوشی سے کوئی تعلق نہ بنتا..

نتالیہ کو اس بدیسی خوراک کی جو کہ اب اس کے دیس کی خوراک تھی ابھی تک عادت نہیں ہو پائی تھی اور اس کے نتھنے لہسن اور ادرک کی بُو کے لیے ترستے تھے۔صرف ایک گلاس دودھ اور آلو کے چند قتلے حلق سے اتارتے ہوئے وہ آشاں بی بی کے ساگ کے ذائقے..پچیس برس پیشتر ایک کچی ہانڈی اور سلگتے اُپلوں والے کچے چولہے پر پکائے جانے والے ساگ کی مہکار میں چلی گئی تھی..

اس انمٹ سفید تنہائی میں..بستر کی چادریں' وارڈ کی دیواریں' نرسوں کے اوورآل..اور موت کی قربت کی سفیدی میں..

موت کو سیاہ قرار دینا بھی کیسا مرگ مذاق ہے..

موت کبھی بھی تاریک نہیں ہوتی..

جنہوں نے اس کا تجربہ چکھا ہے اور پھر لوٹ آئے ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ نور کی ایک دمکتی غار تھی جس میں ہم سفر کرتے تھے.. یہ ہمیشہ بے رنگ ہوتی ہے.. ہمیشہ سفید ہوتی ہے..

تو اس ان مٹ سفید تنہائی کے اکلاپے میں.. جب کہ نتالیہ کا مرض دراصل جان لیوا نہ تھا اور وہ کینسر کا ترجمہ صرف موت کرتی تھی اپنے بے وطن ڈر کے سائے میں آئے ہوئے یہ طے کر چکی تھی کہ وہ اب بہر طور مر جائے گی..

یہ تو ہونے کا نہیں اس کی ناف میں ایک گھومتا ہوا تکلا داخل کر کے اس کے رحم میں پوتھی کے اوراق میں رکھا جو ایک ذرّے برابر بڑھے ہوئے گوشت کا ایک ذرّہ ہے' اسے الگ کر دیا جائے اور وہ بھلی چنگی ہو جائے.. اگر یہ کینسر کی کوئی بھی علامت تھی تو اس کا ترجمہ موت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا.. تو اس ہراس اور موت کے خوف نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ موت کی سفید تنہائی کے اندر مدغم اور کھو جانے سے پیشتر وہ کیا کرنا چاہے گی.. جیسے پھانسی کے پھندے کو گلے میں ڈالنے سے پیشتر یہ پوچھا جاتا ہے کہ تمہاری آخری خواہش کیا ہے تو نتالیہ نے بھی اپنے تئیں اس پھندے کو اپنے گلے کے گرد محسوس کرتے ہوئے اپنی آخری خواہشوں کا دل ہی دل میں ڈوبتے دل میں اظہار کیا..

میں اپنے بچوں کو دیکھنا چاہتی ہوں..

ہاں میری خواہش ہے کہ.. میں اپنے بچوں کو دیکھنا چاہتی ہوں.. سب کو بیک وقت.. بیڈ کے آس پاس.. مجھ پر جھکے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں..

بچے ویسے تو محو تھے.. اپنے کام کاج اور بدن کی آسودگی میں محو تھے.. مگن تھے.. لیکن انہوں نے اپنی ماما کو فراموش ہرگز نہیں کیا تھا.. وہ اس کا دھیان رکھتے تھے.. چھٹی کے روز نہایت مہنگے بُوکے سنبھالتے ہوئے آتے تھے جن کے پھولوں میں ''ماما ووئی مس یو'' یا ''گیٹ ویل سون'' کے کارڈ سجے ہوتے تھے.. وہ بار بار اس کے گالوں کو چومتے اور اس کا ہاتھ تھام کر نہایت الفت بھری نظروں سے اسے دیکھتے تھے اور تھوڑی دیر بعد چلے جاتے تھے.. انہوں نے ماما کے لیے جو دس منٹ مختص کر رکھے ہوتے تھے انہیں پورا کر کے چلے جاتے تھے..

یہ وہ بچے نہیں تھے جو ایک ماما کی خواہش پر پانی کا ایک گلاس تھامے ساری رات اس کے سرہانے کھڑے رہتے ہیں.. جب کہ وہ سو چکی ہوتی ہے.. اور یہ ملک بھی وہ نہیں تھا..

میں اپنے بچوں کو بیک وقت.. سبھی کو.. اپنے آس پاس دیکھنا چاہتی ہوں..

اور اس کے بعد..

اس خواہش کے بعد میں موت کی سفیدی میں اتر جانے سے پیشتر کیا چاہتی ہوں..

رودین کو دیکھنا چاہتی ہوں..سننا چاہتی ہوں..مرنے سے پیشتر..

نتالیہ کے سرہانے ایک فون تھا..

''ہیلو..''

گئی رات جب بوڑھی ہڈیاں بمشکل آرام پر آمادہ ہوتی ہیں ٹیلی فون کی گھنٹی بجے تو وہ ایک اذیت ہوتی ہے..''ہیلو..''

ادھر سے ایک تھکی ہوئی اور بیزار آواز آئی جو رودین کی ہی ہوسکتی تھی..اتنی تحقیق اس نے کر لی تھی..اور یہ پہلی بار تھا کہ وہ اس کی آواز سن رہی تھی اور وہ قدرے مایوس ہوئی کہ ایک کرشن..ایک دیوتا کی آواز ایسی معمولی..انسانی اور جمائیاں لیتی ہوئی تو نہیں ہوتی..

''آپ رُودین بول رہے ہیں؟''

کرشن ان پچیس چھبیس برسوں میں یکسر بھول چکا تھا کہ کبھی وہ ترگنوف کا کردار رُودین بھی ہوا کرتا تھا..

''رُودین؟''اس نے حیرت سے پوچھا..

''جی..''

اور وہ چپ ہوگئی..

''ہیلو...''

''ہیلو...''وہ صرف اتنا کہہ سکی..

''بی بی شاید آپ نے غلط نمبر ملا دیا ہے..یہاں تو کوئی...کیا نام بتایا تھا آپ نے..''

وہ کینسر کی خبر سن کر شاید اتنی ہراساں نہ ہوئی تھی جتنی اب ہوگئی..ایک یکطرفہ عشق کی خط و کتابت اتنے برسوں بعد کون یاد رکھتا ہے..دراصل موت تو یہ تھی کہ وہ اپنے کبھی رودین ہونے کو فراموش کر چکا تھا..اس نے سوچا کہ لاحاصل کی تمنا کرنے والوں کا یہی حشر ہوتا ہے..فون بند کردوں..پھر اسے غصہ آ گیا کہ میں اتنی معمولی بھی نہیں ہوں کہ عمر بھر غم حسینؑ کے برابر اس کا غم لگائے رکھا..یومِ عاشور پر..آستانۂ رومی سے نکلنے کے بعد اب تک جتنے بھی یوم آئے ان سب کی

شام میں آستانۂ رومی میں اس کے لیے قرآن کی اس آیت کو سامنے رکھ کر:

''پس ہم حال جانتے ہیں تمہارے دلوں کا مگر تمہارے لیے پہچان ہے ہر چیز میں تم علم کیوں نہیں دیکھتے۔''

اتنا روئی ہوں اور وہ مجھے بھول جائے.. بے شک بابا کی سفید داڑھی میں سے پھڑ پھڑاتے پرندے جو نکلتے تھے اور حجرے کے گنبد تک کو جا بھرتے تھے ان میں وہ نہ تھا جیسا کہ بابا نے کہا تھا اور ان میں وہ پرندہ نہیں تھا جس کی تُو تلاش میں ہے.... نہیں تھا.. جو تو نے تخیل کی کنواری مٹی کو گوندھ کر بنایا تھا.. نہیں تھا؟''

''نہیں بابا..''

''جان لے کہ یہ تجھے نہیں ملے گا.. جان لے کہ تیرے تصور کا پرندہ تجھے نہیں ملے گا..''

درست کہ وہ نہیں ملا.. وہ حاصل ہو نہیں سکتا تھا اس لیے نہ ہوا... لیکن میں اس لمحے اُس کی ملکیت کی خواہش تو نہیں کر رہی.. صرف اسے دیکھنے یا صرف سننے کی خواہش کر رہی ہوں.. موت سے پیشتر..

''میں نتالیہ ہوں..''

''نتالیہ؟'' وہ جو اتنے براعظموں کے پار.. دنیا کے بڑے بڑے سمندروں کے پار کہیں تھا اٹھ کر بیٹھ گیا..

''ہاں.. آستانۂ رومی کی نتالیہ جو تمہیں رجسٹر میں سے پھاڑے ہوئے لکیر دار کاغذوں پر خط لکھا کرتی تھی... رُودین کو...''

وہ کہنا تو یہ چاہتی تھی کہ میں ایک سیّد زادی تمہارے عشق کے ہاتھی تلے روندی گئی.. جولاہی ہو گئی.. برنے کے پیڑ سے بندھے رسے میں بندھی اپنے خاندان' حسب نسب کو فراموش کر کے جھولتی رہی اور اب مجھے اپنا تعارف کروانا پڑ رہا ہے.. وہ بہت غصے میں تھی اور کسی بھی لمحے فون کو پٹخ سکتی تھی..

''نتالیہ..'' اس نے ایک بار پھر بے یقینی میں دہرایا..

''ہاں...''

ایک بوسیدہ.. بھوری ہوتی ہوئی فائل میں اس کے چند خطوط کہیں.. کسی الماری کی کسی دراز میں شاید ابھی تک پڑے تھے.. اور اس نے کم از کم پچھلے پندرہ برس سے اس فائل کو نہیں کھولا تھا.. وہ خط سارے کے سارے' جو اسے یاد نہیں تھے اب بولنے لگے.. ان کا کاغذ نیا نکور ہو گیا..

حرفوں کی سیاہی جیسے ابھی گیلی ہو..لفافے پر ثبت آستانۂ رومی کی مہر جیسے ابھی لگی ہو..نتالیہ ابھی عدم میں تھی اور ابھی وجود میں آ گئی..

''آپ کہاں سے بول رہی ہو؟''

''تم رُودین ہی ہوناں؟''

''ہاں..''

''بہت بہت فاصلوں پر ہوں..بہت دوری ہے جہاں سے بول رہی ہوں..''

''آپ..''

''میں..آپ نہیں..تم ہوں...''

''تم...کہاں ہو..''

''تمہیں میں یاد بھی ہوں یا نہیں...؟''

وہ بھی پہلی بار اس کی آواز سن رہا تھا..ایک گہری اور بیٹھی ہوئی آواز جیسی جنوب کے نیگرو سنگرز کی ہوتی ہے..کسی قدر مردانہ لیکن اس میں ایک خاص جنسی کشش تھی..اس کا لب ولہجہ امریکی تھا لیکن کہیں کہیں پوٹھوہار کی سادگی جھلک دکھلاتی تھی..

''تم یاد ہو..لیکن تم ہو کہاں؟''

وہ اب یہ کہنا چاہتی تھی کہ میں جہاں کہیں بھی ہوں ابھی تک برنے کی شاخوں سے بندھی پینگ سے جھولتی ہوں..ابھی تک تمہارے لیے اتنی جولاہی ہوں کہ مرنے سے پیشتر اپنے بچوں کے بعد صرف تمہاری آواز سننے کی خواہش کی ہے..

''میں یہیں ہوں..''

''نہیں..تمہاری آواز کٹ کٹ کر آ رہی ہے...''

''میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں بہت فاصلوں پر ہوں..بہت دوری ہے جہاں سے بول رہی ہوں لیکن..میں یہیں ہوں..''

''تم یاد ہو...لیکن..کہاں ہو؟''

''میں نہیں جانتی...صرف یہ کہ میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں...کیا تم مجھے مل سکتے ہو..؟''

''اگر تم کہیں آس پاس ہو تو...''

''میں تمہارے آس پاس آ جاؤں گی...جہاں میں ہوں وہاں محض انتظار ہے..میں

اسے کسی بھی لمحے ترک کر کے آ سکتی ہوں..اگر تم مل سکتے ہو تو...''

یہ کیسا خط کہاں سے آ گیا ہے؟

اندھیری کوٹھڑی میں ایک گڑھے میں ٹانگیں لٹکائے جولاہے نے دیکھا کہ اتنے برسوں بعد جب کہ اس کی سفید ریش کے بال تانے پیٹے میں الجھتے جاتے ہیں...کھیس کے مکمل ہونے کے دن آ گئے ہیں...دھاگوں میں کوئی اٹک کوئی رکاوٹ نہ تھی صرف یہ کہ پچھلے پچیس برسوں نے ان کو قدرے بوسیدہ کر دیا تھا اور ان میں وقت کو مزید سہنے کی سکت نہ تھی...

صرف عشق.. ہمہ وقت زندگی بھر کی موجودگی کا متبادل نہیں ہوسکتا..

بے شک انسان روندا گیا ہو.. اس کے مُو مُو سے عشق بولتا ہو' فریاد کرتا ہو.. حال کے رسے سے بندھا جھولتا رہے.. جولاہا ہو جائے تب بھی.. ایسا عشق بھی.. ہمہ وقت زندگی بھر کی موجودگی' ہمسائیگی' چھونے ایک دوسرے میں مدغم ہونے کی آزادی کا متبادل نہیں ہوسکتا..

وہ رفاقت چاہتا ہے.. ایک مسلسل نزدیکی چاہتا ہے.. دیکھنا چاہتا ہے کہ جو اس کے لہو میں ایک پرندے کی طرح تیرتا ہے' اس کا چہرہ رات کو منہ کھولے سوتے ہوئے بے شک خراٹے لیتے ہوئے.. ان دھلا.. کبھی ستھرا' کبھی لیپا پوتا ہوا.. غصے میں.. بیگانگی اور عارضی نفرت میں.. بیماری میں.. اکتاہٹ اور بیزاری میں.. اس کے سوا کسی اور سوچ میں.. کیسا لگتا ہے.. ایک ہجوم میں.. کسی محفل کے دوران.. شاپنگ کرتے ہوئے.. بچوں کے نیپیز خریدتے ہوئے.. اپنے سائز کے زیر جامہ تلاش کرتے ہوئے.. اپنے عزیزوں کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر.. کسی دوست کے ساتھ اس کی موجودگی فراموش کرتے ہنستے ہوئے.. ایک ڈاکخانے میں ٹکٹ خریدتے ہوئے.. پھل والے سے جھگڑا کرتے ہوئے.. اور جب خواہش کا پرندہ اس کے اندر تیرتا ہے تو اس کا چہرہ کیسا لگتا ہے..

کیا مسلسل ہمسائیگی.. کسی بھی ڈر سے عاری.. بے خوف.. دن رات کی موجودگی اس عشق میں ہلکا سا خلل ڈال سکتی ہے.. اس کی شدت کو کم کرسکتی ہے.. کیا پتہ.. اس خدشے کے باوجود صرف عشق.. زندگی بھر کی موجودگی کا متبادل نہیں ہوسکتا..

ایسا عشق ایک ڈھکوسلا ہوتا ہے..

صرف مجبوری اور بے بسی ہوتی ہے جو بہانے تلاش کرتی ہے.. ایسے افلاطونی عشق کا دفاع کرتی ہے.. اس کی شان میں گیت گاتی ہے کہ اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں

ہوتا.. خطوں کے انبار.. کارڈز.. ہزاروں تصویریں.. فون.. اور اس لاحاصل عشق کو زبان دیتی موسیقی.. شاعری.. چھوٹے چھوٹے تحفے.. زرد پھول.. بال پوائنٹ.. کتابیں.. لپ سٹک کے نشان سب کے سب ایک لمحہ بھر کی نشاط اور اگلے لمحے میں وہ سب کے سب مردہ ہو جاتے ہیں... یہ سب صرف ایک لمس کا بھی متبادل نہیں ہو سکتے چہ جائیکہ پوری زندگی کے ہوں..

یہ مردہ چیزیں اور ہوا میں تیرتے احساسات اتنے عارضی ہوتے ہیں کہ اگر ان کی آبیاری مسلسل نہ کی جائے تو یہ مزید مردہ ہو جاتے ہیں.. کسی کام کے نہیں رہتے..

نتالیہ کے پاس محض چند خطوط تھے جو اس کے عشق کے جواب میں سوائے معذرت کے اور کچھ نہ بیان کرتے تھے.. زندگی بھر کی ہمسائیگی کی خواہش تو احساسات کی برابری کی شدت سے جنم لیتی ہے..

اس کی شادی کو چوبیس برس بیت چکے تھے..

ان میں سے دو آستانۂ رومی کی قربت میں اس کے سسرال میں گزرے جب کہ اس کا خاوند تقریباً ہر چھ آٹھ ہفتوں کے بعد اپنی پوری تنخواہ پھونک کر صرف دو تین دنوں کی چھٹی پر وطن آ جاتا تھا..

اگلے دو برس اُردن میں بسر ہوئے.. اور یہیں پر اس کا پہلا بچہ پیدا ہوا.. زینب ہو بہو اس کی شکل تھی..

ناصر بخاری نے اس کے بہت لاڈ کیے' بہت پیار کیا۔ پہلی شب کی بدمزگی کے باوجود.. وہ شاید اسے فراموش کر چکا تھا اور قدرے شرمندہ بھی تھا.. ایک آرائشی چاندی کی صلیب نے اسے سیخ پا کر دیا تھا..

وہ اسے پیٹرا کے کھنڈر ہو چکے شہر میں بھی لے گیا..

زینب اس کی گود میں تھی..

چٹانوں میں کھودے اور تراشے ہوئے ایک رومی ستونوں والی عمارت کی اوپر اس بلندی تک سیڑھیاں جاتی تھیں' جہاں سے پیٹرا کے چار چفیرے جو چٹانی منظر اور لق و دق صحرا تھے' وہ نظر کے سامنے بچھ جاتے تھے.. دوسرے سیاحوں کی پیروی کرتے ہوئے وہ بھی اس پتھریلے زینے پر سانس درست کرتے پسینہ پونچھتے چڑھنے لگے کہ سورج ڈھل رہا تھا اور چند لمحوں میں غروب کے ساتھ پیٹرا کی سرخ چٹانوں اور آس پاس کے صحرا نے قدیم سونے کی رنگت میں ڈھل

جانا تھا.. یکدم زینب بلکنے لگی.. گرمی اور باپ کے پسینے کی بُو نے شاید اس کے کومل بدن کو ایسے دھچکے دیئے کہ وہ پریشان ہو کر بری طرح رونے لگی.. بار بار تھپکنے اور دلاسے دینے کے باوجود وہ اپنا بے دانت منہ کھول کر آنکھیں میچ کر اپنے رونے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالتی تھی..

''میں اسے نیچے لے جاتا ہوں.. اسے ساتھ لے آنا مناسب نہ تھا..''

''میں بھی چلتی ہوں..''

''نہیں.. نیچے شاید کچھ خنکی ہوگی تو یہ چپ ہو جائے گی.. کار میں اس کا فیڈر چھوڑ آئے تھے.. تم غروب کا منظر دیکھ کر اتر آنا۔''

''میں بھی چلتی ہوں..''

''نہیں...'' ناصر بخاری جب اسے.. اور وہ بہت کم ایسا کرتا تھا.. جب اسے ''نہیں'' کہتا تھا.. بے شک کسی خوراک کے معاملے میں.. کسی گھریلو تنازعے کے حوالے سے یا.. اس کے لباس کو ناپسند کرتے ہوئے.. تو یہ ''نہیں'' ایک حرفِ آخر ہوتا تھا.. ایک حکم ہوتا تھا..

خاوند.. اور آستانۂ رومی کی روایات سے جڑا ہوا.. ایک خاندانی رشتے میں منسلک خاوند بے شک شادی کے ابتدائی دنوں میں بے حد فرماں بردار اور اپنی خوش بختی پر نازاں خاوند.. دو چار برس گزرنے پر.. پہلے بچے کی پیدائش کے بعد تبدیل ہو جاتا ہے اور ایک حاکم بن جاتا ہے..

اس حاکم نے اگر ''نہیں'' کہا ہے تو اس کا مطلب ''نہیں'' ہے..

چنانچہ وہ رک گئی..

ناصر..

زینب کو سنبھالتا سیڑھیوں سے نہایت احتیاط سے اسے سنبھالتا نیچے اتر گیا اور وہ درجن بھر سیاحوں کے ساتھ.. تنہا رہ گئی..

وہ.. درجن بھر سیاح ڈوبتے سورج پر.. پیٹرا کی چٹانوں اور آس پاس کے صحرا پر نہ صرف نظریں جمائے بلکہ کیمرے فوکس کیے ہوئے سورج کے غروب ہونے کے منتظر تھے..

اسے غروب ہونا تھا.. سو ہو گیا..

نتالیہ کے چہار سو جو چٹانیں تھیں.. صحرا کی وسعتیں تھیں، وہ پل بھر میں انکا زیورات کے سونے کی مانند قدیم سنہری ہو گئیں..

غروب کے منظر نے سیاحوں کو ششدر کر دیا..

وہ اپنے کیمروں کے بٹن بھی نہ دبا سکے..

اور تب..اسے..اُس کا خیال آیا..

اس کا..جو ایک پرندہ تھا..اس کے لہو میں تیرتا تھا..

اس کے پاس کوئی ایسا رجسٹر نہ تھا جس کے لکیر دار کھردرے اوراق پھاڑ کر وہ اسے ایک اور خط لکھتی..

اس شفق کی سرخی میں نہاتے ہوئے چٹانی اور صحرائی منظر کو بیان کرتی..اور اسے اُس میں شامل کرتی..

کوئی محمد علی ڈاکیا اگر ایک بدخشانی گھوڑے پر سوار ہونے کی بجائے ایک اونٹ پر بیٹھا..وہاں آ نکلتا تو وہ ضرور ایک خط..اس کے سپرد کر دیتی..کہ بے شک رودین اس لمحے وادیٔ شگر سے پرے..خوبانیوں کے سورجوں سے حاملہ ایک شجر سے کہیں آگے..ایک تیز و تند پہاڑی نالے کے برف پانیوں کے پار..ایک پتھر پر بیٹھے..تمہیں..محمد علی ڈاکیے کو تکتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے چرمی بیگ میں جو خط اس کے لیے ہے وہ میرا ہے..جو اس شفق کی سرخی میں نہائے ہوئے چٹانی اور صحرائی منظر کی کیفیت کو بیان کرتا ہے..پیٹرا کے سرخ شہر میں ابھی ابھی میرا خاوند زینب کو چپ کرانے کی خاطر پتھریلی سیڑھیوں پر اترتا نیچے گیا ہے اور میں یہاں اس بلندی پر ہوں..

اور تمہیں..اپنے رودین کو یاد کرتی ہوں..

دو برس کے اردنی قیام کے بعد وہ لینڈ آف اپرچیونٹی..امریکہ منتقل ہو گئے..

پچھلے بیس برس یہیں گزرے تھے..

ایک ہی شہر میں نہیں..بہتر ملازمت' بہتر سہولتوں اور بہتر موسموں کی تلاش میں وہ کبھی برابر کی ریاست میں منتقل ہو جاتے اور کبھی امریکہ کے دوسرے کونے میں..یونہی بھٹکتے رہے اور یہ دربدری اور مسلسل بھٹکتے رہنا امریکی حیات کا ایک لازمی جز ہے..شاید اسی عارضی خانہ بدوشی پر ان کی ثروت کی بنیاد ہے کہ وہ بستی اہم نہیں' بہتر مواقع اور سہولتیں اہم ہیں..وہ ہماری طرح ایک مقام پر مستقل قیام کر کے اس کے عادی نہیں ہو جاتے..جڑیں نہیں پکڑتے..بست نہیں ہو جاتے..

البتہ پچھلے پانچ برس سے انہیں..یا ناصر بخاری کو قرار آ گیا تھا..اس کی ہمت بھی کم ہو رہی تھی اور بچے بھی بڑے ہو گئے تھے..بچے تو شاید انہیں چھوڑنا چاہتے تھے لیکن وہ ان سے جدا نہیں ہو سکتے تھے..

اس کی بڑی بیٹی زینب..جو ایک زمانہ پہلے پیٹرا کے کھنڈروں میں روئی تھی' اس سے بھی قد میں نکلتی ہوئی تھی..اس کی بناوٹ میں ایرانی صراحیوں کے پیچ وخم تھے' البتہ ان کی نزاکت نہ تھی.. رنگت میں دودھ اور شہد کی گھلاوٹ تھی اور وہ قطعی طور پر ماں باپ بلکہ ماں کا پیش کردہ ایک مسلسل استدلال کہ وہ ایک نجیب الطرفین سیدزادی ہے سمجھ نہیں پاتی تھی..ماما اگر میں دوسروں سے مختلف ہوں تو یہ تو بہت بیزار کرنے والی بات ہے..میں دوسروں کی طرح ہی ہونا چاہتی ہوں اور ہوں..تم مجھے یہ نسل کی برتری کی مزاحیہ کہانیاں نہ سنایا کرو..

زینب پر انہیں کوئی اختیار نہ تھا..

اگر وہ ذرّہ بھر اختیار برتتے تو وہ گھر چھوڑ دیتی..

کسی حد تک اس کی خودمختاری میں ناصر بخاری کا بھی ہاتھ تھا..اگر نہ بھی ہوتا تو شاید وہ یونہی خودمختار ہوتی لیکن یوں کھلے عام چرچا نہ کرتی..

بخاری اردن میں تو اپنے خاندان' مذہب اور ثقافت کی پیروی کرتا رہا..نہایت پرہیزگار اور مشرقی اقدار کا پابند رہا لیکن امریکہ شفٹ ہونے کے بعد اس میں ایک عجیب وغریب تبدیلی آئی..پہلے دو برس گزارنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں..اگر ہے تو وہ اس پر چلنا نہیں چاہتا..اس معاشرے میں اگر مستقل قیام ہے تو پھر اسی رنگ میں رنگا جانا کامیابی اور آسائش کے لیے پہلی شرط ہے..یہاں آستانۂ رومی کی اخلاقیات اور تنگ نظری کی کوئی گنجائش نہ تھی..چنانچہ وہ بہت آگے چلا گیا..یہاں تک کہ اس کے گھر میں منعقد کردہ پارٹیوں میں پاکستانیوں کی تعداد کم سے کم ہوتی کہ وہ ان سے زیادہ میل جول رکھنا پسند نہیں کرتا تھا..وہ ان کے مذہب اور لباس کے بارے میں قدامت پسندی کو نظرِ حقارت سے دیکھتا اور امریکی دوستوں کے ساتھ مل کر ان کی..اپنے وطن' مذہب' ثقافت' لباس اور کھانوں سے جڑے رہنے کی کوشش کا مذاق اڑاتا..

نتالیہ بہت کم اس کے معاملات میں دخل دیتی..کیونکہ اب بھی..امریکیوں سے زیادہ امریکی ہو جانے کے باوجود جب وہ ''نہیں'' کہتا تھا تو یہ حرفِ آخر ہوتا تھا..

زینب..اگرچہ ایک مقدس نام کی حامل تھی..اور وہ اس نام کے پس منظر سے زیادہ آگاہ نہیں تھی اپنی بناوٹ اور بدنی رنگت کے باعث..اور اس کے بال بھی بنگالنوں کی مانند کالے بھور تھے جو اس کے شہد اور دودھ پر مست بادلوں کی طرح امڈتے انہیں بلاخیز کرتے تھے..آرلینڈو

شہر.. میں جتنے بھی گورے اور کالے نوخیز یا عمر ڈھلتے تھے اس کی قربت کے لیے وحشی ہوتے جاتے تھے اور وہ انہیں مایوس کرنا کفر سمجھتی تھی..

ہائی سکول کے بعد اس نے مزید پڑھائی سے انکار کر دیا تھا اور اب آئے دن ملازمتیں بدلتی رہتی تھی..

وہ اس کی اولاد ہونے کے باوجود کسی اور سیارے کی مخلوق تھی، جس کی زبان، لباس اور رہن سہن سراسر اجنبی تھے..

زینب نے اپنے ماں باپ کا دل نہ دکھانے کی خاطر البتہ یہ قربانی ضرور دی تھی کہ وہ اپنے دوستوں کو اپنے گھر میں مدعو تو کرتی تھی لیکن ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ وہاں رات گزارنے کی اجازت نہ دیتی تھی..

زینب کے بعد دارا آیا تھا.. اور امریکہ آنے کے بعد آیا تھا..

داراشکوہ اپنی بگ سسٹر کی مقبولیت پر سیخ پا ہو کر اس کے آشناؤں کو قتل کرنے کے درپے نہیں ہوتا تھا بلکہ الکوہل اور منشیات کے مرکب کی دھند میں گم دارا نہایت فخر سے ڈینگیں مارتا تھا کہ مائی سسٹر زیب... وہاٹ اے گرل.. ہول ٹاؤن از کریزی اباؤٹ ہر..

دارا.. جو اب ڈیرن تھا، اپنی ماں کے فرسودہ اور الجھے ہوئے دماغ میں ابھی تک قیام پذیر قصے کہانیوں سے عاجز آ چکا تھا، اسے ایک کریزی اولڈ وومین سمجھنے پر مجبور تھا..

یہ کریزی اولڈ وومین جس نے ابھی تک اپنے بال نہیں کٹوائے تھے اور وہ اب بھی اس کی کمر تک جاتے تھے اور ان میں سفیدی بھی کم کم تھی، اسے عجیب کہانیاں سناتی تھی.. ڈیرن اس لیے سنتا تھا کہ امریکی معاشرہ خاندانی وحدت پر زور دیتا تھا..

''تم بھولو نہیں کہ ہم لوگ پاکستان سے یہاں آئے ہیں دارا.. اور ہم بیشتر پاکستانیوں کی طرح ایرے غیرے نہیں ہیں.. ٹیکسی چلانے والوں.. گیس سٹیشن پر یا ٹائلٹ صاف کرنے والوں میں سے نہیں ہیں.. ہماری کاسٹ بہت سپریئر ہے.. ہم آل اولاد ہیں حضور پاکؐ کی.. وہ ہمارے نانا ہیں..''

''رئیلی..'' دارا شاید تأسف میں.. شاید مزاح میں.. شاید حیرت سے منہ کھول کر اپنی ماما کا دل نہ دکھانے کی خاطر صرف اتنا کہتا..

''تمہارے ایک پرنانا تھے جنہیں ہم لوگ ''بابا'' کہتے تھے اور میں ان کی گود میں بیٹھ کر